Rizwan Ullah
D-178, Abul Fazl Enclave
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Tel: 9971283786
Email:ruilmi@rediffmail.com

شکاگو میں دانشوروں کے درمیان

رضوان اللہ

امریکی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم غیر ملکی طلبہ کے متعلق ایک حالیہ سروے کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستانی شہروں سے امریکہ جانے والے طلبہ میں سب سے زیادہ تعداد حیدرآباد کے طلبہ کی ہوتی ہے اور دنیا بھر سے آنے والے طلبہ کی تعداد کے اعتبار سے حیدرآباد کا نمبر چوتھا ہے۔ امریکہ میں غیر ملکی طلبہ سے متعلق یہ انکشافات یقیناً چونکانے والے ہیں لیکن میرے لیے اس رپورٹ میں زیادہ نیا پن نہیں ہے۔ میں نے کوئی تین دہائیاں پہلے یہ بات محسوس کی تھی، ہاں اس طرح نہیں محسوس کی تھی۔ شکاگو کی نارتھ ایسٹرن ایلی نوائے یونیورسٹی میں سیاسیات کے پروفیسر ڈاکٹر محمد اسد سے میں نے یہی سوال کیا تھا کہ میں امریکہ کے جن شہروں میں بھی گیا وہاں اصحابِ حیدرآباد سے ملاقات ہوئی اس کی کیا وجہ ہے؟ انھوں نے کئی وجہیں بتائیں اور سب سیدھی اور صاف اور سمجھ میں آنے والی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ جب حیدرآباد میں ہندوستانی فوج نے پولیس ایکشن کیا تو جس کو جہاں سینگھ سمائی بھاگ نکلا، اس ریلے میں بہتیرے حیدرآبادی امریکہ آ گئے۔ اس زمانے میں امریکہ آنے والوں پر کوئی خاص روک ٹوک نہیں تھی، غیر ملکی طلبہ کا خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ پھر آنے والے اپنے لواحقین اور متعلقین کو بلاتے گئے ہوں گے اور مختلف شہروں میں پھیلتے گئے ہوں گے۔

لیکن اس کے علاوہ ایک عمومی وجہ بھی تھی وہ یہ کہ دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر یوروپی ملکوں کی تباہ حال معیشتوں سے متاثر لوگ تلاشِ معاش میں امریکہ جا رہے تھے، یہی کیفیت ایشیائیوں کی بھی تھی اور امریکہ آنے والوں پر کوئی خاص روک ٹوک بھی نہیں تھی۔ دانشوروں، سائنسدانوں، انجینئروں وغیرہ کا خیر مقدم کیا جا رہا تھا یونیورسٹیاں بالخصوص غیر ملکی طلبہ کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔ اسی اثنا میں حیدرآباد میں ہندوستانی فوج کا پولیس ایکشن بھی ہوا اور اس ریلے میں اس علاقے کے بہت سے لوگ ہر طرف گئے تو امریکہ بھی چلے گئے۔ اس سلسلے کی ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ میں نے ہوسٹن کے اسلامی مرکز میں اور شکاگو کے مسلم کمیونٹی سینٹر میں حیدرآباد کا اردو روزنامہ ''رہنمائے دکن'' دیکھا، اس کے علاوہ دہلی کا روزنامہ ''دعوت'' بھی دونوں جگہ دیکھا۔ غالباً مقامی لوگوں میں سے کوئی صاحب یہ اخبارت منگاتے ہوں گے اور ان مرکزوں پر رکھ دیتے رہے ہوں گے۔

ڈاکٹر اسد صاحب پٹنہ کے رہنے والے تھے وہاں ایک اردو روزنامہ ''ساتھی'' میں کام کرتے تھے۔ ان سے

میری ملاقات وہیں کی تھی، لیکن مجھے ان کے امریکہ جا کر وہاں شکاگو میں مقیم ہونے کا بھی علم تھا۔ چنانچہ سانفرانسسکو سے شکاگو پہنچنے کے بعد میں نے سب سے پہلے انہی سے رابطہ کیا۔ کچھ دیر بعد وہ میرے ہوٹل آئے اور مجھے اپنے کالج لے گئے۔ انھوں نے بتایا کہ اسی یونیورسٹی کے فٹ بال گراؤنڈ کے نیچے وہ زمین دوز ایٹمی تجربہ گاہ تھی جہاں ایٹم شکتی کا اولین تجربہ کیا گیا تھا۔

امریکہ کا تیسرا بڑا شہر شکاگو شمالی ریاست ایلی نوائے میں لیک مشی گن کے کنارے واقع ہے، یہاں کا موسم عجیب ہوتا ہے۔ گرمیوں میں امس ہوتی ہے اور سردیوں میں شدید سردی ہوتی ہے اور برف باری بھی ہوتی ہے۔ تقریباً ۲۸ رلاکھ کی آبادی میں کوئی ۶۰ رہزار مسلمان شامل ہیں، جن کے ایک درجن سے زیادہ ادارے اور تنظیمیں ہیں۔ مختلف نسلی آبادیوں والے علاقے ہیں، جیسے ہمارے شہروں میں محلے ہوتے ہیں۔ ایک علاقے کے بازار میں ایشیائی اسی کثرت سے نظر آرہے تھے، جیسے کسی ایشیائی شہر میں ہوں۔ بہتیرے دکاندار ایشیائی تھے، جن کی دکانوں میں ایشیائی لباس پوشاک اور اسی طرح کی دوسری چیزیں نظر آرہی تھیں۔ شکاگو کے ویسٹرن ایونیو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا بھر کے شہروں میں سب سے لمبی مسلسل شاہراہ ہے۔ لیکن ہمارے لیے تو سب سے زیادہ کشش اور دلچسپی کی چیز سیرس ٹاور تھا اس کا مختصراً بیان ابھی کردوں۔ میں شکاگو پہنچے کے بعد تیسرے روز اس کو دیکھنے کے لیے گیا تھا۔

Sears Tower کی اونچائی ۱۴۵۱ فٹ (۴۴۲ میٹر) ہے۔ ۱۰۸ منزلہ اس فلک بوس عمارت کی تعمیر ۱۹۷۰ء میں شروع ہوئی تھی اور ۱۹۷۴ء میں مکمل ہوئی۔ اس وقت اس کو صرف امریکہ میں نہیں بلکہ دنیا کی بلند ترین عمارت ہونے کا شرف حاصل تھا۔ (۱۹۹۷ء میں کوالالمپور، ملیشیا میں پترونس ٹاورس کی تعمیر کے بعد سیرس ٹاور کا وہ ٹائٹل چھن گیا اور یہ رتبہ ملیشیائی ٹاور کو حاصل ہوگیا)۔ ۲۰۰۹ء میں اس کا نام بھی چھن گیا۔ اس سال ویلس گروپ نے اس عمارت کے ایک حصے کو لیز پر لینے کے بعد اس کا نام بدل کر ویلس ٹاور رکھ دیا تاہم سیرس ٹاور کے نام سے ہی اس کی شہرت بدستور باقی ہے اور دنیا بھر کے کوئی دس لاکھ سیاح ہر سال اس عمارت کی مشاہدہ گاہ سے مشاہدوں کا لطف لینے کے لیے آتے ہیں۔ یہ مشاہدہ گاہ ۱۰۳ ویں منزل پر ۱۳۵۱ فٹ (۴۱۲ میٹر) کی بلندی پر واقع ہے۔ اس کے لفٹ ساٹھ سیکنڈ میں اس بلندی تک پہنچا دیتے ہیں وہاں پہنچ کر بلندی پر دباؤ کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے حاشیائی بارجوں پر دوربینیں لگی ہوئی ہیں، جن کے ذریعے ایلی نوائے کے میدانی علاقوں کا دور تک اور مشی گن لیک کے پار تک کے علاقوں کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس ٹاور کے انجینئر ایک بنگالی فضل الرحمٰن خاں تھے۔ انھوں نے اس کی تعمیر میں انجینئرنگ کی کوئی خاص ٹیکنک استعمال کی تھی۔ بعد میں سعودی حکومت نے خانہ کعبہ کی توسیع کے ایک پروجیکٹ پر کام کے لیے ان کو سعودی عرب بلا لیا تھا وہیں ان کا انتقال بھی ہوا۔ خیر

سانفرانسسکو سے دوپہر میں روانگی کے بعد شمالی امریکہ کے میدانوں اور سبزہ زاروں پر تقریباً چار گھنٹے کی پرواز کے بعد شام کو شکاگو پہنچا۔ اس وقت کہیں آنا جانا یا کسی سے ملنے ملانے کا کوئی موقع نہیں تھا، اس لیے ہوٹل ہی میں آرام کیا۔ میں اپنے ہر بیرونی سفر میں خصوصاً کسی انجانے شہر میں ایک احتیاط ضرور کرتا تھا وہ یہ کہ غروب آفتاب کے بعد ہوٹل سے باہر نہیں نکلتا تھا اگر کہیں دیر بھی ہوئی تو جلد سے جلد اور کسی مقامی شخص کی رہنمائی میں واپس ہوٹل

آجاتا۔ دوسرا سب سے بڑا مسئلہ کھانے کا ہوا کرتا تھا۔لیکن اس معاملے میں آسانی یہ تھی کہ پاؤ روٹی، انڈا، مرغ کا گوشت اور کئی طرح کے پھلوں کے جوس ہر جگہ مل جاتے تھے۔ اسی کھانے کی مجبوری کی وجہ سے کہیں کسی دوست ملاقاتی نے ضیافت کی پیشکش کی تو اسے بلاتکلف قبول کر لیتا تھا۔لیکن دو تین ہفتے کے اس سفر اور بے اعتدالیوں کی وجہ سے شکاگو میں اگلے دن صبح کو میرے پیٹ میں کچھ تکلیف ہو ہی گئی۔ واشنگٹن میں اپنے آفس سے رجوع کیا وہاں پروگرام منیجر نے ایک ٹیبلٹ بتائی جو ڈاکٹر کے نسخے کے بغیر دوا کی دکان پر مل سکتی تھی وہی لایا جس سے آرام ہو گیا۔ امریکہ میں دوا اور غذا سے متعلق قوانین بہت سخت ہیں ان کی خلاف ورزی کرنے والے دوا فروشوں کے لائسنس فوراً کینسل کر دیے جاتے ہیں۔ میری طبیعت کی بے کیفی کی وجہ سے ایک پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔ میں کسی مضافاتی قصبے کی زندگی اور وہاں کے حالات کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک قریبی قصبہ فری پورٹ جانے اور وہاں ایک روز قیام کا ارادہ تھا وہاں نہیں جا سکا اور وہ دن جوں توں شکاگو میں گزار دیا۔ پہلے تو فری پورٹ جانے کے لیے بس کا ٹکٹ لینے کے لیے گیا پھر جب وہاں نہ جانے کا فیصلہ کر لیا تو ایک بار پھر ٹکٹ واپس کرنے کے لیے ہوٹل سے وہاں گیا۔ لیکن اس اثناء میں شکاگو یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر چودھری محمد نعیم صاحب سے گفتگو ہو گئی تھی اور شام کو ان سے ملاقات کا پروگرام طے پایا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہوٹل ہی میں چائے پی جائے اور کچھ دیر باتیں بھی ہوں لیکن چودھری صاحب خود ہوٹل تشریف لائے اور مجھے اپنے گھر لے جانے پر مصر ہو گئے، چنانچہ ہوٹل سے نکل کر بس پکڑی اور ان کی قیام گاہ پر پہنچے۔ان کی کار چوری ہو گئی تھی، اس لیے بس ہی سے آنا جانا ہوا۔ان کی اہلیہ کہیں باہر گئی ہوئی تھیں اس لیے گھر میں وہ تنہا تھے اس پر سے ان کا اصرار کہ کھانا کھا کر جانا ہوگا۔ میں تھکا ہوا تھا اور کھانا وغیرہ ٹھیک سے نہ کھانے کی وجہ سے کمزوری بھی محسوس کر رہا تھا۔صوفے میں بیٹھتے ہی سو گیا، ہاں کچن میں ڈاکٹر صاحب کو گلو پہنتے دیکھا تھا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے جگایا۔ ہم لوگوں نے کھانا کھایا اس کے بعد انھوں نے مجھے ہوٹل واپس پہنچا دیا۔ میرے چشمے کا کیس کہیں گم ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے چشمے کا کیس مجھے دے دیا جسے اب تک میں نے بطور امانت محفوظ رکھا ہے۔ وہ وہاں پروفیسر ایمیریٹس ہیں۔ جاڑوں میں ہندوستان بھی آتے ہیں۔ دہلی اور شملہ میں کب کہاں ان کا قیام ہوتا ہے کچھ پتہ نہیں چلتا، اگر کسی پروگرام میں ان کی شرکت کی خبر آتی ہے تو وہ دوسرے تیسرے دن آتی ہے، اس وقت وہ نہ معلوم کہاں ہوتے ہیں، چنانچہ ان سے ملاقات کی نوبت نہیں آتی اس میں میری ذاتی اور طبعی کمزوریوں کا بھی بڑا دخل ہے۔

ڈاکٹر اسد صاحب نے بتایا کہ اعظم گڑھ کے ڈاکٹر عبدالسلام انصاری صاحب شکاگو یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر ہیں، ان کا ٹیلی فون نمبر بھی مجھے دیا۔ اگلے دن میں نے ان کو ٹیلی فون کیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑے کہنے لگے کہ اعظم گڑھ کے ایک اور صاحب یہاں بیٹھے ہیں ان سے بات کیجیے وہ میاں سعید الرحمٰن تھے، ہمارے ہدیٰ بھائی مرحوم (شمس الہدیٰ فاروقی) کے صاحبزادے شمس الرحمٰن فاروقی کے عم زاد بھائی کے بیٹے تھے۔ وہ ایک قریبی شہر ڈیون پورٹ کے ایک کالج میں انگلش ٹیچر تھے اور ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے بڑی قربت محسوس کرتے تھے تو کبھی کبھی ان سے ملاقات کے لیے فیملی کے ساتھ آجایا کرتے تھے۔ ان کی شادی ہمارے چچا زاد بھائی آفتاب احمد فاروقی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ پھر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب اور سعید دونوں مصر ہو گئے کہ مجھے ہوٹل چھوڑ کر ڈاکٹر

صاحب کے گھر آ جانا چاہیے۔ اتنا ہی نہیں وہ دونوں حضرات میرے ہوٹل پہنچ گئے اور مجھے اٹھالائے۔

ڈاکٹر عبدالسلام انصاری صاحب ہمارے پڑوسی گاؤں کوپا گنج کے رہنے والے تھے۔ ہمارے گاؤں پہلے ضلع اعظم گڑھ میں تھے اب ضلع مئو میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مسلم کمیونٹی سینٹر کے فعال ارکان میں سے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس ادارے سے بھی متعارف کرایا۔ یہ کمیونٹی سینٹر ایک خاصا بڑا فعال ادارہ ہے۔ (ظاہر ہے یہ تین دہائیوں پہلے کی بات ہے، اب تو اس کی سرگرمیوں میں اور بھی توسیع اور اضافہ ہوا ہوگا) یہ ایک بہت بڑے بلاک میں قائم ہے، جسے مقام مسلمانوں نے اپنے عطیات اکٹھا کرکے چھ لاکھ ڈالر میں خریدا تھا اور اس کا سالانہ خرچ ایک لاکھ ڈالر تھا۔ اس میں ایک وسیع مسجد ہے جسے پریر ہال کہتے ہیں۔ ایک کانفرنس ہال ہے۔ ایک لائبریری ہے، ایک کمیونٹی ہال اور غسلخانہ وغیرہ ہے۔ دینی تعلیم اور حفظ قرآن وغیرہ کا بھی اہتمام ہے کہ جو لوگ اس سے استفادہ کرنا چاہیں کرسکتے ہیں۔ اس مرکز کی مسجد کے امام صاحب بھی حیدرآبادی تھی۔ رمضان کا مہینہ تھا، وہاں تراویح میں تقریباً دوسو نمازی شریک ہوتے تھے۔ اس مرکز کا ایک ماہانہ نیوز لیٹر بھی شائع ہوتا ہے۔ اس نیوز لیٹر کے ایڈیٹروں سے ایک ملاقات بھی ہوئی، اس موقع پر مرکز کے دیگر اراکین بھی موجود تھے۔ گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ ہم دیگر مقامی لوگوں سے رابطہ بڑھانے کے لیے کیا کریں۔ ظاہر ہے اس موقع پر موجود حضرات سب دانشور تھے لیکن رابطہ عامہ بذات خود ایک فن ہے، اور اس میں کامیابی کے لیے ترتیب اور مہارت کی ضرورت اسی طرح ہوتی ہے، جیسے دوسرے پیشوں میں۔ میں نے انھیں بتایا کہ وہ مقامی نمائندوں کو جو کسی بھی ریاستی یا مقامی ادارے سے وابستہ ہوں اپنی تقریبات میں مدعو کریں جس سے انھیں کچھ بتانے کی ضرورت نہ رہے بلکہ وہ خود مشاہدے کریں اس طرح ممکن ہے وہ اپنی تقریبات میں آپ کو بھی مدعو کریں۔ اسی طرح مقامی مطبوعات سے مستقل رابطے میں رہیں، اپنے نیوز لیٹر کی کاپی انھیں بھیجیں اور اپنی خبروں کے علاوہ دیگر مقامی خبروں کو بھی اپنے نیوز لیٹر میں جگہ دیں۔ ان مشوروں پر پسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔

شام کو ایک صاحب ہمارے میزبان تھے۔ شاید کہنے کی ضرورت نہ ہو کہ وہ حیدرآباد کے تھے۔ اہلِ حیدرآباد کی مہمان نوازی مشہور ہے اور خود ان کا کہنا ہے کہ حیدرآباد میں روٹیوں کی جتنی قسمیں ہوتی ہیں کہیں اور نہیں ہوتیں۔ وہ شام رمضان کی تھی، اس لیے افطار کا اہتمام تو تھا ہی اس میں خاص طور سے قابلِ ذکر شربت روح افزا تھا اس پر مستزاد یہ کہ وہ روح افزا ہندوستانی تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ہندوستانی شربت روح افزا پاکستانی روح افزا سے بہتر ہوتا ہے۔

عزیزم سعید الرحمٰن ہمیں شکاگو کے بازار کی سیر کے لیے لے گئے اور انھوں نے ہی سیرس ٹاور کی بھی سیر کرائی جہاں سے ہم نے دور دور تک کے علاقوں کا مشاہدہ کیا۔ میری روانگی سے پہلے والی شام کو وہ اپنے شہر واپس چلے گئے۔ وطنیت کے ناطے ڈاکٹر انصاری صاحب مجھے ایئرپورٹ تک پہنچانے کے لیے آئے۔ میں شکاگو سے نیویارک کے لیے روانہ ہوا۔ چند مہینے بعد ہی وہ وطن آئے تو میں نے دہلی ہوائی اڈے پر موصوف سے ملاقات کی۔

امریکہ میں منتخب عہدے

اگرچہ امریکہ میں واحد وفاقی حکومت ہے لیکن اس میں حسبِ ذیل شامل ہیں

۵۰ ریاستی حکومتیں

۳ لاکھ سے زیادہ عہدے مقامی حکومتوں کے (کاؤنٹی، سٹی اور ٹاؤن کی)

اور تقریباً ۲ لاکھ مخصوص مقاصد کے اضلاع جیسے کہ اسکولی اضلاح، پانی کے اضلاع، نتیجے کے طور پر امریکی ووٹروں کو صرف صدر اور کانگریس (پارلیمنٹ) کے لیے نہیں ووٹ دینا ہوتا ہے بلکہ ریاستی اور مقامی حکومت کے ہزاروں عہدیداروں کے لیے بھی ووٹ دینا ہوتا ہے جن میں ریاستی قانون ساز ممبر، ریاستی گورنر اور لیفٹیننٹ گورنر، ریاستی آڈیٹر، کاؤنٹی کمشنر، ٹاؤن اور سٹی میئر، ایلڈرمین، جج، کانسٹبل، مجسٹریٹ، شریف، جسٹس آف پیس اور اسکول بورڈ، کالج بورڈ، یوٹیلٹی بورڈ کے ممبران اور عوامی ٹرسٹ کے عہدیدار شامل ہیں۔

کچھ غیر معمولی قسم کے منتخب عہدے بھی ہیں جیسے کاؤنٹی کورونر، آبپاشی اضلاع اور ٹاؤن سمڑی کمیشنوں کے ممبر اور درختوں کے وارڈن یعنی وہ افسران جو شہری املاک پر مخدوش درختوں کو ہٹانے کی نگرانی کرتے ہیں۔